خالی سیپ

(ایک سچی کہانی)

تحریر.....محمد اجمل بیگ ناز۔لاہور (راوی.....فرزانہ)

زندگی خدا کا ایک انمول عطیہ ہے جسے کچھ لوگ اس طرح آسائشوں میں گذارتے ہیں کہ غم کی ہلکی سی پرچھائیں بھی ان کی زندگی کو داغدار نہیں کرتی لیکن اس کارزارِ ہستی میں ایسے لوگ بھی زندہ ہیں جن کی زندگی موت کی دہلیز تک مسلسل سسکتی رہتی ہے۔وہ صرف سانس کا قرض اتارنے کیلئے اپنے آپ کو زندہ رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں وگرنہ زندگی ان کیلئے کوئی خوشگوار تجربہ نہیں ہوتا۔دنیا کے پیمانے ہر انسان کیلئے یکساں نہیں اسی لئے ہر انسان زندگی کی مسرتوں سے یکساں طور پر لطف اندوز نہیں ہوتا اور نہ زندگی کی بہاریں ہر کسی کا مقدر بنتی ہیں۔ہر انسان الگ الگ اپنی زندگی کے دن پورے کر کے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں آتا جاتا رہتا ہے۔زندگی ایک بند سیپ کی مانند ہے اور زندہ رہنے کا بہانہ وہ انمول موتی ہے جو سیپ کے خول میں بند ہوتا ہے۔یہ موتی.....یہ سیپ ہر کسی کو میسر نہیں آتا۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس موتی کی تلاش میں انسان اپنی زندگی کا سیپ کھو دیتا ہے اور کبھی یہ انمول سیپ کسی کی لاپرواہی یا زیادتی سے اس طرح فنا ہو جاتا ہے کہ ٹوٹنے کے بعد اس کا جڑنا اسی طرح ناممکن ہو جاتا ہے جس طرح شیشے میں آیا ہوا بال نہیں جاتا۔

عاشی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد انہیں یہ کھلونا میسر آیا تھا اسی لئے وہ گھر بھر میں بہت لاڈلی تھی۔وہ بچپن سے ہی کمزور جسم تھی جونہی موسم کی رُت بدلتی اس پر کسی نہ کسی مرض کا حملہ ہو جاتا مگر تھی وہ بڑی خوبصورت اور چُھوئی مُوئی سی جسے ہر کوئی پیار کرتا۔جونہی اس کی شعور کی کونپلیں پھوٹیں اسے قریب کے مڈل سکول میں داخل کروا دیا گیا۔استاد ماں باپ کے بعد بچے کیلئے سب سے اہم شخصیت ہوتے ہیں کیونکہ وہ اس کے کردار کی تشکیل کرتے ہیں۔بچہ استاد کی شخصیت اور کردار کے حوالے سے بہت سی باتیں اپنی ذات میں سمونے کی کوشش کرتا ہے مگر مِس سیمی ایسی نہیں تھی۔اس کی ذات میں بَلا کا غصہ اور تیزی تھی اور وہ بات بات پر بچوں کو چَھڑی سے پیٹ دیتی تھی۔اس کی ظالمانہ اور سخت طبیعت سے سب بچوں کو خوف آتا تھا اور یہ خوف اس قدر پر اثر تھا کہ اکثر وہ اپنا یاد کیا ہوا سبق بھی بھول جاتے تھے۔سارے سکول میں اس کی دَھاک سی بیٹھی ہوئی تھی۔اس کے باوجود وہ تدریس جیسے مقدس پیشے سے منسلک تھی۔دوسرے بچوں کی طرح عاشی بھی مس سیمی کی غصیلی طبیعت کو اچھی طرح سمجھتی تھی اور اس نے کبھی بھی اسے شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔اپنا کلاس ورک اور ہوم ورک باقاعدگی سے کرنا اس کا معمول تھا۔پچھلے دو سالوں میں عاشی کو صرف دو مرتبہ مار پڑی تھی۔ایک مرتبہ جب اس نے ایک لڑکی کو اس لئے پیٹ دیا تھا کہ اس نے عاشی کی نئی سفید قمیض پر سیاہی گرا دی تھی اور دوسری مرتبہ جب وہ بلا اطلاع ایک روز کیلئے سکول سے غیر حاضر ہو گئی تھی وہ بھی اس لئے کہ دوسرے شہر میں اس کی نانی جان کا انتقال ہو گیا تھا اور تمام گھر والوں کو ایمرجنسی میں جانا پڑا تھا۔

مِس سیمی کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر ہفتے کے دن اپنی کلاس کے کسی ایک مضمون کا ٹیسٹ ضرور لیتی تھی۔اس کیلئے باقاعدہ ایک شیڈول مرتب کیا گیا تھا جس میں مہینے بھر کے ٹیسٹوں کے بارے میں تفصیل درج ہوتی تھی۔جو بچی ٹیسٹ کے روز غیر حاضر ہوتی مِس سیمی اگلے روز اس کی خوب خبر لیتی۔زنّاٹے دار چھڑی جب ہتھیلیوں پر سرخ نشان چھوڑنے لگتی تو آئندہ غیر حاضر نہ ہونے کا ارادہ خود بخود ذہن میں ترتیب پانے لگتا۔

ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ عاشی کو زوروں کا بخار ہو گیا اور اسی دوران مِس سیمی کے شیڈول کے مطابق ریاضی کا ٹیسٹ ہوا جس میں عاشی غیر حاضر شمار ہوئی حالانکہ اس نے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کے ساتھ ایک ہفتے کی چھٹی کیلئے باقاعدہ درخواست بھیج دی تھی جسے ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے منظور بھی کر لیا تھا۔جس روز بخار اترا نقاہت کے باوجود اگلے

روز عاشی سکول پہنچ گئی مگر آج شائد اس کی قضا اس کے سر پر کھیل رہی تھی۔

اسمبلی کے بعد عاشی بھی اپنی کلاس فیلوز کے ساتھ اپنے کلاس روم میں چلی گئی اور اپنے تعلیمی معمولات میں مشغول ہوگئی۔مِس سیمی کا پیریڈ آیا تو وہ ایک دھماکے سے کلاس روم میں داخل ہوئی اور آتے ہی اپنی گرجدار آواز میں حکم دیا.....''جو بچیاں ریاضی کے ٹیسٹ میں غیر حاضر تھیں وہ کھڑی ہو جائیں۔''

عاشی جانتی تھی کہ وہ بیماری کی وجہ سے چھٹی کی درخواست بھجوا چکی ہے لہذا اصولی طور پر اسے غیر حاضر شمار نہیں کیا جانا چاہئے۔یہی سوچ کر وہ اعتماد سے اپنی کرسی پر بیٹھی رہی۔پانچ لڑکیاں کھڑی ہوگئیں اور دل ہی دل میں سوچنے لگیں کہ پتہ نہیں مِس کیا سزا دے کیونکہ آج اس کے ہاتھ میں وہ چھڑی نہیں تھی جو اُن کی ہتھیلیوں کے رنگ تبدیل کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔یہ سب عادی غیر حاضر بچیاں تھیں جو ہر بار ٹیسٹ سے بچنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تراش لیتی تھیں اور مار کھانا ان کا معمول بن چکا تھا اور کسی مشغلے سے کم نہ تھا۔مِس سیمی نے نظریں گھما کر کلاس کی بچیوں کا جائزہ لیا اور عاشی کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔اپنی خون آشام نگاہوں سے اس کے معصوم چہرے کو زخمی کیا تو عاشی سہم کر کھڑی ہوگئی اور ہمت کر کے بولی.....

''مِس میں نے بیماری کی درخواست بھیج دی تھی۔''
مِس سیمی کا پارہ یہ غیر متوقع جواب سن کر اوپر ہی اوپر جانے لگا۔
''تم نے درخواست بھجوادی تھی مگر ٹیسٹ میں تو تم غیر حاضر تھی نا؟'' مِس سیمی نے غصے بھری آواز میں کہا۔
عاشی اور سمٹ گئی مگر دل کڑا کر کے بولی.....''مِس آپ چاہیں تو آج میرا ٹیسٹ لے لیں''

مِس سیمی جواب دیئے بغیر الماری کی طرف چلی گئی،الماری کا پَٹ کھولا اور بَید کی ایک لمبی سے چھڑی باہر نکالی جسے دیکھ کر کھڑی ہوئی بچیوں کے دل کانپ کر رہ گئے۔پانچوں لڑکیوں نے دونوں ہاتھوں پر چار چار چھڑیاں کھائیں اور ہتھیلیوں کو سہلاتی ہوئی نیچے بیٹھ گئیں۔ان کے بعد مِس سیمی خونخوار درندے کی طرح عاشی کی طرف بڑھی اور طنزیہ انداز میں بولی.....''ہاں تو کیا کہا تھا تم نے.....تمہارا ٹیسٹ آج لے لوں؟''

''ہاتھ باہر نکالو'' وہ چیخی.....اور عاشی کی معصوم ہتھیلیوں پر بیدردی سے بید پڑنے لگے۔عاشی تکلیف سے تڑپتی رہی مگر مِس سیمی کی ظالمانہ طبیعت میں رحم کا جذبہ بالکل نہیں تھا۔یہ اذیت عاشی کی برداشت سے باہر تھی کیونکہ بخار کی کمزوری ابھی تک اس کے جسم میں موجود تھی۔تکلیف کی اذیت جب برداشت سے بڑھ گئی تو عاشی نے اچانک اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور مِس سیمی کا نشانہ خطا ہوگیا۔اپنے وار کی ناکامی مِس سیمی کیلئے ناقابلِ برداشت تھی جس سے اس کی وحشت میں اور اضافہ ہوگیا۔آج تک کسی لڑکی نے مار کھاتے ہوئے ہاتھ کھینچ لینے کی جرأت نہیں کی تھی۔اپنے وار کی ناکامی کے بعد مِس سیمی کی دیوانگی کا یہ عالم ہوا کہ اس نے پوری قوت سے عاشی کی پنڈلیوں پر اندھا دھند بَید برسانا شروع کر دیئے۔عاشی کے صبر کی انتہا ہوگئی اور وہ رونے لگی۔اسی وقت ہیڈ مسٹریس صاحبہ راؤنڈ پر کلاس میں داخل ہوئیں اور انہوں نے یہ ہولناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تو مِس سیمی کو سخت الفاظ میں تنبیہ کی کہ وہ آئندہ محتاط رویہ اختیار کریں اور بچیوں کو ایسی سخت سزا نہ دیں۔اس دوران عاشی فرش پر گر چکی تھی۔لڑکیاں نتائج کی پروا کئے بغیر بے ساختہ اس کی طرف بڑھیں اور اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا۔عاشی بدستور رَو رہی تھی۔

مِس سیمی کا پیریڈ ختم ہوا تو کلاس کی ساری لڑکیاں عاشی کے گرد جمع ہوگئیں اور اسے دلاسہ دینے لگیں۔
''ارے لگتا ہے تمہاری ٹانگ سے خون نکل رہا ہے''۔ایک لڑکی نے حیران ہو کر کہا۔

''ہاں ہاں دیکھو تمہاری شلوار پر خون لگا ہوا ہے.....''ایک دوسری لڑکی نے تصدیق کرتے ہوئے عاشی کی توجہ اس طرف دلائی تو وہ پریشان ہوگئی اور ہاتھوں میں اپنا منہ رکھ کر زور

زور سے رونے لگی۔ایک لڑکی نے عاشی کی شلوار اونچی کر کے دیکھا تو پنڈلی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ سُوجھی ہوئی لگ رہی تھی۔

''چلو آفس میں چل کر وہاں زخم پر دوائی لگوالو''۔چار پانچ لڑکیوں نے عاشی کو زبردستی اس کی کرسی سے اٹھادیا اور اسے آفس کی طرف لے چلیں۔عاشی سے چلانہیں جا رہا تھا۔تکلیف کی شدت سے وہ بار بار اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔دوائی لگوانے کے بعد لڑکیاں عاشی کو واپس کلاس روم میں لے آئیں۔عاشی چھٹی کے وقت تک خاموش اور گم سم بیٹھی رہی۔اسے کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنی کتابوں سے بے نیاز تھی اور بے چینی سے چھٹی کا انتظار کر رہی تھی۔آخر خدا خدا کر کے چھٹی کی گھنٹی بجی اور عاشی بمشکل اپنی کرسی سے اٹھی۔ایک لڑکی نے اس کا بستہ اٹھالیا اور اس کی چند دوست اسے گھر تک چھوڑنے گئیں۔

ماں نے بیٹی کی یہ حالت دیکھی تو یکدم پریشان ہوگئی اور عاشی کے ابّو کو اطلاع دی جو معاملے کی نوعیت کے پیشِ نظر فوری طور پر عاشی کو قریبی ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ڈاکٹر نے تسلی دی اور اچھی طرح پٹّی کرنے کے علاوہ کھانے کیلئے بھی دوا دی تا کہ زخم جلدی ٹھیک ہو جائے۔دوسرے روز عاشی کی امّی اور ابّو سکول گئے اور مِس سیمی کے رویّے پر ہیڈ مسٹریس سے سخت الفاظ میں شکایت کی جس کے نتیجے میں مِس سیمی نے تو معذرت کر لی مگر اس کے بعد عاشی سکول نہیں گئی اور نہ ہی اس نے چھٹی کیلئے کوئی درخواست بھجوائی۔اس کی ساری توجہ اپنی ٹانگ کی تکلیف اور اس کے علاج پر مرکوز ہو کر رہ گئی اور یہی اس کی سوچ کا واحد محور بن کر رہ گیا۔

اگلے ایک ہفتے تک ڈاکٹر نے عاشی کی ٹانگ کا زخم ٹھیک کرنے کیلئے اپنے تجربے کے مطابق بدل بدل کر دوائیاں دیں مگر افاقہ نہ ہوا تو والدین کی تشویش بڑھ گئی۔دسویں روز ڈاکٹر نے یہ کہہ کر عاشی کے ابو کی پریشانی میں اور اضافہ کر دیا کہ.....''آپ بچی کو ہسپتال لے جائیں کیونکہ زخم خراب ہو گیا ہے.....کوئی دوا اثر نہیں کر رہی.....ہوسکتا ہے آپریشن کی ضرورت پڑے!''

اکلوتی بیٹی کا دُکھ دیکھ کر ماں باپ تڑپ کر رہ گئے۔ماں کو تو یہ سُن کر جیسے سکتہ سا ہو گیا۔

اسی شام عاشی کو ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ڈاکٹروں نے تفصیلی معائنے کے بعد جو کچھ بتایا وہ دونوں والدین کیلئے موت کی طرح بھیانک تھا۔اس کے ابو تو سَر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ڈاکٹروں نے یہ انکشاف کیا کہ زخم کی حالت اس حد تک خراب ہو چکی ہے کہ گوشت کی سڑاند سے زہر بن چکا ہے جو آہستہ آہستہ پنڈلی سے اوپر کی جانب سرایت کر رہا ہے۔ڈاکٹروں نے یہ بھی صاف صاف کہہ دیا کہ اگر یہ دوائیوں سے کنٹرول نہ ہو سکا تو بچی کی جان بچانے کیلئے ٹانگ کاٹنے کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔دوسری صورت میں یہ زہر سارے جسم میں پھیل کر موت کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

ڈاکٹروں نے دو چھوٹے چھوٹے آپریشن کر کے گوشت کے مردہ حصے نکال کر زخم ٹھیک کرنے کی پوری کوشش کی مگر.....وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ بچی کی جان بچانے کیلئے پنڈلی تک ٹانگ کاٹنا ضروری ہو گیا ہے وگرنہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔والدین کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔دکھ سے ان کی حالت غیر ہو رہی تھی اور آنے والے وقت کی سنگینی کا احساس کر کے ان کی آنکھوں میں غم کے سایے مزید گہرے ہوتے جا رہے تھے۔عاشی کی امی کا حال تو دیکھا نہ جاتا تھا۔انہوں نے رَو رَو کر اپنی عجیب حالت بنالی تھی مگر اس صورتِ حال سے رہائی کا کوئی متبادل رستہ نہ تھا۔ناچار روتے دھوتے عاشی کے ابو نے کانپتے ہاتھوں سے آپریشن کی رضامندی کے فارم پر دستخط کر دیئے کیونکہ انہیں اپنی بچی کی زندگی بہرحال زیادہ عزیز تھی۔

اگلے ہی روز آپریشن تھیٹر میں ایک الیکٹرک آری چلی اور عاشی اپنی آدھی بائیں ٹانگ سے محروم ہو گئی۔اسے جب ہوش آیا تو اس کا جسم اُدھورا ہو چکا تھا۔مارے صدمے کے وہ زور زور سے چیخنے لگی مگر اس کی آواز گلے میں گُھٹ کر رہ گئی۔رفتہ رفتہ اس کی آہیں سسکیوں میں تبدیل ہو گئیں اور اس کی جگہ مسلسل آنسوؤں کی ایک جھالر نے لے لی جو اس کے گالوں سے موتی بن کر گرتی رہتی۔دھیرے دھیرے یہ آنسو بھی خاموش ہو گئے مگر اس کے سینے کا طوفان بڑھ گیا۔معذوری کی اس غیر متوقع حالت نے اس کی ہمت توڑ دی

کیونکہ زندگی کو اس زاویے سے دیکھنے کا اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ اپنی زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی فطری خواہش اس میں بھی موجود تھی مگر ٹانگ کٹ جانے پر اس کے سپنوں کا شیش محل چکنا چُور ہو گیا۔ اسی طرح اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹر بننے کا خواب آپریشن ٹیبل پر دم توڑ گیا اور وہ کسی طرح بھی اپنے دل کے درد کا مداوا نہ کر سکی۔

ٹانگ کٹنے کے بعد بھی عاشی کی طبیعت سنبھل نہ سکی۔ اس کی ٹانگ میں اکثر درد کی زوردار ٹیسیں اٹھتیں جن کی شدت سے وہ بے حال ہو جاتی۔ ڈاکٹروں کی ہدایت اور مشورے کے مطابق ایک سال تک عاشی کا گھر پر علاج ہوتا رہا مگر ٹانگ کی تکلیف میں کمی نہ آئی۔ انتہائی شدت کی صورت میں عاشی کا ایک بار پھر تفصیلی معائنہ ہوا اور ڈاکٹروں نے معائنے کے بعد انکشاف کیا کہ ''آپریشن کے باوجود زہر کنٹرول نہیں ہو سکا اور اوپر کی جانب سرایت کر چکا ہے.....اور بچی کی جان بچانے کیلئے دوبارہ آپریشن کرنا پڑے گا۔''

''کیا مطلب ڈاکٹر صاحب؟'' عاشی کے ابو تقریباً چیخ پڑے۔
ڈاکٹر نے عاشی کے ابو کو حوصلہ دیا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا.....
''ٹانگ ران تک کاٹنی ہوگی.....یہ آخری چانس ہے''

''ہائے میری بچی کی قسمت!'' یہ کہتے ہوئے عاشی کے ابّو غم کی شدت سے زمین پر گر گئے اور بے ساختہ رونے لگے مگر یہ رونا عاشی کی ٹانگ کو نہ بچا سکا۔ بلکتی ممتا کی دعائیں اور منتیں بے اثر ثابت ہوئیں الوراگلے روز عاشی کو بیہوش کر کے ٹانگ کا یہ حصہ بھی اس کے جسم سے نوچ لیا گیا تو اس کی رہی سہی امیدیں بھی دَم توڑ گئیں۔ اس کی جینے کی امید ماند کیا پڑی وہ خود کو زندگی کیلئے بوجھ سمجھنے لگی۔ لکڑی کی مصنوعی ٹانگ بھی اُس کے ارادوں کو جوان اور پُرعزم نہ بنا سکی یہاں تک کہ وہ اُدھورے جسم کے ساتھ جوانی کی حدود میں داخل ہو گئی۔ جوان جذبوں، بکھری امنگوں اور ناتمام آرزوؤں نے اس کی زندگی میں ہلچل مچا دی۔ جونہی وہ اپنی بکھری ہوئی زندگی کو سمیٹنے کی کوشش کرتی تو اپنے جسم کا ادھورا پن اس کی کوششوں کو نگل لیتا اور وہ بے بس پنچھی کی طرح اپنے پنجرے کی حدود تک رہنے پر مجبور ہو جاتی۔

عاشی اپنی زندگی کو کسی مَصرف میں نہ لا سکی اور نہ ہی وہ مصنوعی ٹانگ کا استعمال سیکھ سکی کیونکہ وہ ذہنی طور پر کاٹھ کے اس سہارے کو قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔ بس سارا دن کرسی پر بیٹھی اپنی تقدیر کے تانے بانے کو سلجھانے میں لگی رہتی۔ جب کبھی اس کی سہیلیاں اسے ملنے کیلئے آتیں تو وہ تھوڑی دیر کو چہک اٹھتی، اس کے چہرے پر زندگی کی چمک دکھائی دینے لگتی اور ہونٹوں کی پنکھڑیاں مسکراہٹوں سے سج جاتیں مگر ان کے جانے کے بعد اسے اپنے اکیلے پن کا احساس پہلے سے بھی زیادہ ہونے لگتا اور وہ دوبارہ اپنی تنہائی کے تحت الثریٰ میں گر جاتی۔ اس کی اکثر سہیلیوں کی شادی ہو چکی تھی اُن کی بھری پُری اور شاداب زندگی دیکھ کر عاشی قدرتی طور پر احساسِ کمتری کا شکار بھی تھی۔ وہ اکثر سوچتی کیا میں بھی بیاہی جاؤں گی.....کیا میرا بھی کوئی اپنا گھر ہوگا.....جہاں میں اپنی سہیلیوں کی طرح خوش و آباد رہوں گی؟ لیکن اس کی زندگی میں کوئی شہزادہ نہ آیا اور اسی امید پر اس کی زندگی کی بیس بہاریں گزر گئیں۔

عاشی کا اکیلا پن ہر وقت اس کی ذات کو کریدتا رہتا اور وہ اپنی زندگی کے جہنم میں ہر روز مَرتی اور ہر روز جیتی رہی۔ اس درمیانی کیفیت نے اسے کہیں کا نہ رکھا اور وہ اکثر بیمار رہنے لگی۔ اس کی زندگی آہستہ آہستہ موم کی طرح پگھلتی جا رہی تھی اور وہ اپنی معذوری کا کفن پہنے قضائے اجل کی منتظر تھی۔ زرد چہرہ، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، ہونٹوں پر جمی پپڑی اور بکھرے بال اس کے دل کی ویرانی اور سینے کی سُلگن کا واضح ثبوت تھے۔ یہی سُلگن ایک دن چنگاری سے شعلہ بنی اور بارہ سال تک ناامیدی اور دکھوں کے ہچکولے کھا کر عاشی اس دنیا سے ہمیشہ کیلئے رُوٹھ گئی اور اپنی زندگی کا قرض اتار کر خالی دامن ہی دوسری دنیا کو سِدھار گئی۔ اس کی زندگی کے سیپ میں وہ انمول موتی ہی نہیں تھا جسے پا کر وہ اپنی زندگی کی بہاروں سے لطف اندوز ہو سکتی۔ اس نے جوانی کی تپش میں بیساکھیوں کا سہارا لیکر جب اس سیپ کو کھولنے کی کوشش کی تو وہ اندر سے خالی نکلا.....اس کی زندگی کی طرح خالی اور بے مراد!.....ماں باپ نے اپنی اکلوتی بیٹی کی ڈولی اس طرح رخصت کرنے کا سوچا تک نہ تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ عاشی موت کی بانہوں میں سو چکی تھی اور ان کے گھر کو ہمیشہ کیلئے سُونا کر کے جا چکی تھی۔ ماں کی گود بھی خالی ہو گئی.....شائد اس کی زندگی کا سیپ بھی اولاد کی خوشیوں سے خالی تھا! ❁❁❁